انگریز کا بنوایا ہوا۔ کچھ کرایہ دینا پڑتا ہے۔ خیر کوئی خفا ہو جائے ہمارا خدا خفا نہ ہو۔ کوئی نہ کوئی جگہ رہنے کو مل ہی جائے گی۔ کیا مُردوں کو جگہ ہے زندوں کو نہیں۔ پردیس کا واسطہ۔ یہاں دو آدمی مل جل کے رہتے تھے۔ دکھ بیماری میں سب طرح آرام ملتا۔ مگر وہ تو بعضے لوگوں کو اکیلے رہنے کی عادت ہے۔ دو سے تیسرا آنکھ میں ٹھیکرا، ہے ہے کیا بری عادت ہے۔ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں جن کو چار آدمیوں کی آبادی نہیں اچھی لگتی۔ آدم بیزار۔

یہ سب باتیں مرزا عابد حسین کی بیوی اپنے کانوں سنتی رہیں مگر ایک کان گونگا کر لیا۔ ایک بہرا۔ خلاصہ یہ کہ مرزا فدا حسین کی بیوی سوار ہو گئیں۔ مرزا فدا حسین کو اس علیحدگی کا ضرور ملال ہوا۔ اس خیال سے کہ تنخواہ قلیل تھی۔ میاں کل اخراجات کے بار سے سُبک دوش تھے۔ صرف اپنے دم کی فکر تھی۔ اب سارے گھر کا خرچہ اور وہی پندرہ روپے۔ مگر ان مصلحتوں کو ان کی بیوی کیا سمجھتی تھیں اور اگر سمجھتی بھی تھیں تو ان کی زبان کب مانتی تھی۔

القصہ مرزا فدا حسین صاحب نے اپنے بیوی بچوں کو اس مکان میں اتارا۔ اس مکان کو دیکھ کے بیوی بہت گھبرائیں۔ ایک دن وہ تھا کہ انجینیر صاحب کے بنگلے کو یہ نام رکھتی تھیں۔ اے ہے یہ بھی کوئی مکان ہے جس میں انگنائی نہیں۔ کمروں میں گھٹے بیٹھے رہو۔ اس مکان میں چھوٹی سی انگنائی ضرور تھی، مگر نیچی چھتیں۔ تنگ مکان۔ دروازے سے جھانک کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ کوسوں تک کا جنگل تھا۔ بھلا شہر کے رہنے والوں خصوصاً عورتوں کا ایسی جگہ کیا دل لگتا۔ کچھ دن رہے گاڑی پہنچی تھی۔ سرِ شام تو بالکل ہی دم قلق کرنے لگا۔ رات کو تین بجے تک مارے خوف کے نیند نہ آئی۔

دوسرے دن زندگی کا سہارا اس طرح ہوا کہ چوکیدار کی جورو منشی جی کی

بیوی سے ملنے کو آئی۔ اس نے خوب گھل مل کے باتیں کیں۔ سودے سلف کا حال بھی اس سے دریافت کیا۔ یا یوں کہیے کہ آپ نے کہیں اس سے کہا کہ میرے پاس پان نہیں۔ ایک دو پیسے کے پان منگا دے معلوم ہوا کہ ایک گاؤں یہاں سے تین چار کوس کے فاصلے پر ہے۔ وہیں سے گیہوں، چاول، دالیں، نمک خرید کر کے آتا ہے۔ پان بھی وہیں ملتے ہیں۔ مگر بازار کے دن۔ گوشت اٹھوارے میں ایک مرتبہ ملتا ہے وہ بھی اگر آدمی وقت پر پہنچ جائے۔ نہیں تو بک جاتا ہے۔ اتنے میں مرزا فدا حسین باہر سے آئے۔ مکّا کی جورو گھونگھٹ سے منہ چھپائے باہر چلی گئی۔ مرزا صاحب اپنی بیوی کی بدعادتوں سے واقف تھے اور مرزا عابد حسین کے گھر سے نکلنے کا غصّہ ان کے دل میں بھرا ہوا تھا۔ مکّا کی جورو کو دیکھتے ہی اس دن کی تصویر صاف ان کی آنکھوں میں پھر گئی جس دن مکّا کی جورو سے پھکڑ ہوتی ہوگی مگر اس وقت انھوں نے چھیڑنا مناسب نہ جانا۔ بات دل میں لیے رہے۔ باہر جا کے دو ایک مرتبہ خیال آیا کہ مکّا کو سمجھا دیں کہ اپنی جورو کو گھر میں نہ جانے دے مگر کچھ کہتے سنتے نہ بن پڑا۔ آخر بات گئی گذری ہوئی۔

دوسرے دن مکان کی مرمت کے لیے مزدور لگائے۔ پردے کی وجہ سے سخت تکلیف ہوئی۔ ڈاک بنگلہ خالی پڑا تھا۔ بیوی بچوں کو چند روز کے لیے اسی میں اٹھا لے گئے۔ یہ بنگلہ بہت ستھرا اور ضروریات کے اسباب سے آراستہ تھا۔ بیچ کے ہال میں دری کا فرش تھا۔ درمیان میں ایک میز لگی تھی۔ چار پانچ کرسیاں رکھی تھیں۔ پہلو کے دونوں کمروں میں بہت ہی عمدہ نواڑی کے پلنگ لگے تھے۔ کنارے ایک میز لگی تھی۔ اس پر ایک صندوقچہ سنگار دان معہ آئینہ کے رکھا ہوا تھا۔ ایک

طشتری میں صابن رکھا تھا۔ میز کے خانے میں کئی سفید تولیے رکھے ہوئے تھے۔

مرزا فدا حسین کی بیوی یہ سامان دیکھ کے بہت خوش ہوئیں۔ میاں سے کہنے لگیں آخر جو تم وہاں گلیہ میں پڑے ہوئے ہو یہیں آن کے کیوں نہیں رہتے ؟

مرزا فدا حسین :۔ یہ ہمارے رہنے کے لیے نہیں ہے۔ اس میں خود مرزا صاحب آکے اترتے ہیں یا جب کوئی انگریز دورے پر آتا ہے تو وہ رہتا ہے۔

بیوی :۔ آج کل تو بالکل خالی پڑا ہے۔ بھائی صاحب جب دورے پر آئیں گے رات کی رات سو رہیں گے اور اگر دو ایک دن رہیں گے تو کیا حرج ہے۔ جب انگریز کوئی آنے والا ہوگا بنگلہ خالی کر دینا اسی گھر میں چلے جائیں گے۔ کوئی ہمیشہ تھوڑا ہی رہے گا۔ رات کی رات رہ کر چلا جائیگا۔

میاں :۔ یہاں تمہارا رہنا مناسب نہیں۔ جو مکان رہنے کے لیے دیا گیا ہے اسی میں رہنا چاہیے۔

بیوی :۔ تمہارے کہنے سے مناسب نہیں۔ اچھا خاصہ بنگلہ چھوڑ کے وہاں مرغیوں کی ڈھابلی میں جا کے رہیں۔

میاں :۔ مرغیوں کی ڈھابلی ہماری تقدیر میں ہو تو بنگلے میں ہم کیونکر رہ سکتے ہیں ؟

بیوی :۔ تم رہو مرغیوں کی ڈھابلی میں۔ ہم تو یہیں رہیں گے۔ دیکھیں ہمیں کون نکال دیتا ہے۔ چھوٹے بھیا کا مزاج اس طرح کا نہیں۔ میں خوب جانتی ہوں۔ بیوی ان کی ہیں بس کی گانٹھ اور ایک وہ موافقتہ باقر ٹھیک اپنی ماں پر پڑا ہے۔ نا صاحب! باپ اس طرح کا نہیں۔ اگر ان کا بس ہوتا

تو کبھی ہم کو جدا نہ ہونے دیتے مگر ذرا نیک آدمی ہیں۔ بیوی سے ڈرتے ہیں۔ جتنے نیک آدمی ہیں وہ بیویوں سے ڈرتے ہیں۔ بیویوں کے کہے پر چلتے ہیں اور جتنے موئے بدمرد ہوتے ہیں وہ بیویوں پر جوتا تیز رکھتے ہیں۔ اس بارے میں چھوٹے بھیا کو ہرگز برا نہیں کہہ سکتی۔ جو چاہا چھوٹی بھابی نے کیا۔ ذرا چار پیسے ہو گئے تو کیا اتراتی ہیں۔ وہ دن بھول گئے جب دن بھر سوئیاں بھونکتی تھیں تو رات کو روٹی نصیب ہوتی تھی۔

سچ ہے اپنے دن کس کو یاد رہتے ہیں

میاں :۔ چھوٹی بھابی تو بس کی گانٹھ نہیں۔ یہ تمہاری زبان کہیں چین سے نہ رہنے دے گی۔ میں سب تمہاری حرکتیں سن چکا ہوں۔ بس اب ان باتوں کو جانے دو۔ تم نے مجھ کو کہیں کا نہ رکھا۔ چھوٹے بھیا نے جس وقت مجھ سے علیٰحدہ ہونے کو کہا ہے اس وقت ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

بیوی :۔ میں تو خود ہی کہتی ہوں کہ چھوٹے بھیا کا کوئی قصور نہیں۔ جو کیا باقر نے اور باقر کی ماں نے کیا۔

میاں :۔ باقر تو ایسا نیک لڑکا ہے کہ دنیا جہان کے ایسے لڑکے ہوں۔ ماشاءاللہ اس سن میں کیا لیاقت پیدا کی ہے۔

سامنے میاں ذاکر بغلوں میں ہاتھ دیے کھڑے ہیں۔ ایک یہ مردود لونڈا اتنا بڑا ہو گیا ہے اور بات کرنے کی تمیز نہیں۔ میاں ذاکر نے جو یہ دیکھا کہ ابا جان اماں سے لڑتے لڑتے اب میری طرف ڈھلے ہیں، چپکے سے باہر کھسک گئے۔

بیوی :۔ واہ بڑے لونڈا کہنے والے۔ تم سے میں نے لاکھ دفعہ کہہ دیا کہ تم میرے بچوں کو ہونسا مت کرو۔ جیسے انھوں نے پال پال کے بڑا کیا ہے۔ باقر کی

تعریفیں کرتے ہو۔ ذاکر میں کیا برائی ہے۔ پڑھنا لکھنا تقدیر سے۔ باقر پڑھا کیا ہے۔ وہی گٹ پٹ انگریزی کچھ پڑھا ہو مگر اتنے سن میں وہ غرور ہے کہ معاذ اللہ۔ یہ ساری باتیں ماں کی ہیں۔ بادا بیچارے تو جب گھر میں آتے تھے، مجھے جھک جھک کے سلام کرتے تھے۔ صاحبزادے جو آئے تو نہ سلام علیک نہ کسی سے پوچھنا نہ گچھنا۔ ہاں۔ اماں کے کلیجے میں بیشک گھسا رہتا ہے۔

میاں :۔ باقر کیا جانے تم کون بلا ہو۔ جو تمہیں سلام کرتا۔ بچپنے سے وہ باہر رہا۔ کسی عزیز کنبے کو اس نے دیکھا ہوتا تو وہ جانتا۔

بیوی :۔ اچھا۔ وہ میں تو بدزبان مگر تم اپنی زبان کو دیکھو (تم کون بلا ہو) تم خود بلا بھوت، پلیت ہو گے۔

میاں :۔ اچھا۔ وہ میں ہی سہی۔ میں نے تو ایک بات کہی۔ باقر تم کو کیا جانے؟

بیوی :۔ اچھا۔ اس سے کیا ہے تم باقر کی اور اس کی ماں کی غلامی کرو ہم نہیں کرتے۔

میاں :۔ اگر ہم اشراف ہیں تو ضرور باقر کی اور باقر کی ماں کی بلکہ ان کے گھر کے غلاموں تک کی غلامی کریں گے۔ چھوٹے بھیا نے تو ہمارے ساتھ وہ احسان کیا ہے کہ تمام عمر اس بار سے سر نہیں اٹھا سکتے۔ ایک تم بے احسانی ہو کہ چھوٹے بھیا کے بیوی بچوں سے جلتی ہو۔

بیوی :۔ موئی پندرہ روپلی کی نوکری کے لیے تم جوتیاں کھاؤ۔ اور کسی کو کیا غرض ہے۔ ہم تو یہ خیال کرتے ہیں کہ آخر عزیز کنبہ ہوتا کس لیے ہے؟ ایک سے ایک کا کام نکلتا ہے۔ دوسرے وہ ایسا احسان ہی کیا کیا۔ جس کے لیے تم بچھے جاتے ہو۔ یہی نا پندرہ روپلی کا نوکر کرا دیا پھر شہر چھڑا دیا۔ گھر چھڑوا دیا، بار چھڑوا دیا اور کچھ تنخواہ انھیں اپنی گرہ

سے دینی پڑتی ہے۔ سرکار میں ایک اسم لگا دیا ہے کچھ اپنے پاس سے دیتے تو ایک بات تھی۔

میاں :۔ تم تو بے مغزی ہو۔ اپنے پاس سے جہاں تک مقدور تھا دیا پچاس روپے نقد لکھنؤ جاتے وقت دیے تھے۔ یہاں اتنے دنوں سارے گھر کا بوجھ بار اٹھایا اور کیا کوئی اپنا گھر لٹا دیتا ہے؟

بیوی :۔ تمہاری بھی کیا باتیں ہیں۔ کبھی کچھ کہتے ہو کبھی کچھ کہتے ہو۔ تم تو کہتے تھے کہ وہ روپے پڑھوائی کے دیے تھے پھر اس کا احسان کیا؟

میاں :۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا عقل ہے۔ ارے پڑھوائی بھی کوئی حق ہے، دینے کا ایک بہانہ تھا اور اگر پڑھوائی کے نام سے دیتے تو میں لیتا۔ بچوں کے نام سے دیے تھے اس لیے لینا پڑا۔

بیوی :۔ اچھا تو اگر بچوں کے نام سے دیے تھے تو ایک دن کے تین سو ساٹھ دن ہیں۔ ماشاءاللہ ان کے آگے بھی تو لڑکی ہے۔ جب لڑکی کی شادی ہوگی ہم بھی ایک چالا کر دیں گے۔ خدا دے گا سو روپیہ کا جوڑا پہنا کے گھر بھیجیں گے۔

میاں :۔ لڑکی کے چالے کا کیوں ذکر کرتی ہو۔ یہ کیوں نہیں کہتیں کہ چھوٹے بھیا کو سات پارچے کا خلعت دیں گے۔

بیوی :۔ ادہی۔ پھر کیا ہوا۔ وہ تم سے چھوٹے ہیں۔ اگر ان کو بھی کچھ دو گے تو کیا انکار کر سکتے ہیں؟

میاں :۔ روٹی کھانے کو نصیب نہیں اور چھوٹے بھیا کو سات پارچے کا خلعت دیں گے!

بیوی :۔ تو کیا خدا کو دیتے ہوئے دیر لگتی ہے؟

میاں :۔ تمہارے گن ہی ایسے ہیں کہ خدا تم کو دے گا۔

بیوی :۔ ہاں۔ پھر ہم تو برے ہیں۔ اچھا پھر اب کوئی اچھی سی ڈھونڈ لاؤ اور اسے چھوٹی بھابی کی لونڈی گری میں دے دو۔

میاں :۔ اچھا۔ خلاصہ یہ کہ تم اس بنگلے میں نہیں رہنے پاؤ گی۔

بیوی :۔ پھر تم نے وہی بات نکالی۔ ہم تو تمہاری ضد سے یہیں رہیں گے۔

میاں :۔ تو تم اس طرح کی باتیں کرتی ہو جیسے تمہارے باپ کا مکان ہے یا میرے باپ کا۔ ہم تو یہیں رہیں گے کیا زبردستی ہے۔ جھوٹا پکڑ کے باہر نکال دی جاؤ گی۔

بیوی :۔ یہ تم ہنسی ہنسی میں باپ تک پہنچ جاتے ہو۔ تو انگریز ہمارے باپ ٹھہرے اور جھوٹا پکڑ کے نکالی جائیں تمہاری اماں بہنیا۔ بس مجھ سے اس طرح کے کلام نہ کرنا۔ نہیں تو اپنا منہ پیٹ لوں گی۔

میاں :۔ میں نے اپنے باپ کو بھی تو کہا۔ اس میں برا ناحق مانتی ہو اور میری اماں بہنیا جب کسی کے گھر میں ڈھئی دیں گی تو ضرور نکالی جائیں گی بلکہ جس طرح تم کہتی ہو اسی طرح۔ اور یہ دھمکی ہے کہ منہ پیٹ لوں گی تمہارا منہ دیکھے گا میرا کیا نقصان ہے؟

میاں کی یہ تقریر سن کے بیوی ایسی کھسیانی ہوئیں کہ سچ مچ انھوں نے دو چار طمانچے اپنے منہ پر لگائے اور چیخنا شروع کیا۔ مرزا فدا حسین تو ان حرکتوں سے واقف تھے۔ ان کو کچھ زیادہ تعجب نہیں ہوا مگر باہر مکا چوکیدار اور کئی مزدور جو بنگلے کے پاس آم کے درخت کے نیچے چلم اڑا رہے تھے وہ کیا سمجھے کہ بنگلے میں سانپ نکلا ہے۔ اپنے اپنے لٹھ سنبھال کے بنگلے کے برآمدے میں آ کھڑے ہوئے۔

"منشی جی! کیا سرپ نکلا ہے۔ ذرا پردہ کر دیجیے"

مرزا فدا حسین نے سب کو بہ لطائف الحیل ٹال دیا۔

القصہ بیوی اپنی ضد کر کے اس بنگلے میں رہیں اور چار ہی دن میں بنگلے

کو حیثیت سے بے حیثیت کر دیا۔ جابجا دیواروں پر پیک کے چھپکے، دری پر پتیلیوں کے پیندوں کی سیاہی کے نشان، تیل کے چکتے۔ دونوں پلنگوں کو لڑکوں نے کود کود کے دو ہی دن میں جھولا کر دیا، سنگار دان کا شیشہ چکنا چور کر دیا، دروازوں کے کئی شیشے توڑ ڈالے، فراشی پنکھا جو ہال میں لگا تھا اس کو بی ہرمزی اور میاں ذاکر نے جھولا بنایا، ایک دن وہ پنکھا ٹوٹ کے گرا، دونوں کے سخت چوٹ آئی، کرسیوں میں تو شاید ہی کوئی ثابت بچی ہو، میزوں کی وارنش لبالب پانی کے کٹورے رکھنے سے جابجا خراب ہو گئی، تو لیے سب کے سب سالن بھرے ہاتھ پونچھ پونچھ کے فلیتے کر دیے۔ غرض کہ دس ہی بارہ دن میں ڈاک بنگلہ اور اس کے اسباب کو بالکل تہس نہس کر دیا۔ اسی زمانے میں بڑے انجینیر صاحب دورے پر آئے۔ اس ضرورت سے بنگلے کو جلدی جلدی خالی کرنا پڑا۔

صاحب نے آکے بنگلہ کا جو یہ حال دیکھا، بہت ہی ناخوش ہوا۔ مرزا فدا حسین کو بلوا کے بہت کچھ سخت وسست کہا۔ دس روپئے جرمانہ کیے۔ اور مرزا عابد حسین صاحب کو ایک چھٹی ان کی شکایت کی لکھ بھیجی۔ اس کا مضمون یہ تھا کہ:-

"محرر جو آپ نے نوکر رکھا ہے سخت نالائق ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے اپنے خاندان کو ڈاک بنگلے میں لا کے رکھا ہے۔ اس وجہ سے بنگلہ اور بنگلے کا اسباب بالکل خراب ہو گیا ہے۔ ہم نے فی الحال دس روپیہ جرمانہ منشی پر کیا اور آئندہ اگر اس قسم کا قصور اس سے سرزد ہو گا تو اس کو موقوف کر دیں گے۔ اطلاعاً آپ کو تحریر کیا گیا"

مرزا عابد حسین کو اس چھٹی کے دیکھنے سے جس قدر ملال ہوا اس کا اندازہ نہیں ہو سکتا۔

اس واقعہ کے بعد میاں بیوی میں قیامت کی جنگ ہوئی مگر اس تفصیل

کو بہ لحاظ طول قلم انداز کرتے ہیں۔

مکّا کی جورو سے گھر کے کام کاج میں بہت مدد ملتی تھی۔ آٹا بھی وہی پیس دیتی تھی۔ اس کا شوہر مکّا سودا سلف لا دیتا تھا مگر اس سے بھی آخر ایک دن خوب پھکڑ ہوئی۔ مکّا نے اپنی جورو کو ان کے گھر میں آنے جانے کو منع کر دیا۔

اس اثناء میں محرّم قریب آگیا تھا۔ محرّم سے پہلے مرزا فدا حسین نے عیوضی دے کے ایک مہینہ کی رخصت لی۔ بیوی بچوں کو گھر پہنچایا۔ آپ جہاں پڑھوائی پر جاتے تھے وہاں گئے اور وہاں سے پلٹ کر کے پھر اپنی نوکری پر واپس آئے۔ اس کے بعد مرزا فدا حسین ایک عرصہ تک ملازم رہے مگر بیوی بچوں کو بلانے کا نام نہ لیا اگرچہ طرح طرح کی تکلیفیں تھیں مگر یہ سب انھوں نے گوارا کیں۔ سختی جھیل گئے۔ آدمی کارگر ثابت ہوئے اس لیے وقتاً فوقتاً ترقی ہوتی رہی۔ آخر پچاس روپے کے سب اوورسیر ہو گئے۔

ذاکر کو ہونہار دیکھ کر مرزا صاحب نے رکھ لیا تھا۔ لڑکا تربیت پذیر تھا۔ چند روز کے بعد کچھ تھوڑا پڑھ لکھ کے ٹھیکہ داری کا کام کرنے لگا۔ جوان ہوتے ہوتے بہت سا روپیہ کمایا۔ مرزا صاحب کی صحبت کی برکت سے اگرچہ یہ خاندان بہت ہی تباہ تھا مگر بالآخر کچھ نہ کچھ درستی حال ہو ہی گئی۔

جس زمانہ میں مرزا صاحب پر مقدمہ قائم ہوا تھا، مرزا فدا حسین نے حق قرابت خوب ادا کیا۔ بیچارے زمین کے گز بن گئے تھے۔ اس خوش سلیقگی سے پیروی کی کہ آخر مرزا صاحب فتح یاب ہوئے اور مفسدوں کو جیل خانہ ہو گیا۔

مرزا عابد حسین صاحب جب اودھ کے ایک ضلع میں پہلے پہل ملازم ہو کے گئے۔ سرا میں اترے۔ صاحب سے ملاقات کی۔ کارِ سرکاری سپرد ہوا۔ اس عرصے میں اس بستی کے بہت سے لوگ ان کو پہچاننے لگے۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ چھوٹی بستیوں میں بہ نسبت بڑے شہروں کے بہت جلد شہرت ہو جاتی ہے۔ دو ایک صاحب شریف صورت اس بستی کے رہنے والے جو اپنے ذاتی منافع کے باب میں بڑے خوش فکر اور دور اندیش ہوتے ہیں، ان سے سرا میں آ کے ملے۔ ایسے لوگوں کو خواہ مخواہ فکریں رہتی ہیں کہ فلاں عہدے پر کون مقرر ہوا؟ کس کی تبدیلی ہوئی؟ کس کی ترقی ہوئی؟ کس کا تنزل ہوا۔ غرضکہ یہ لوگ زندہ گزٹ ہوتے ہیں اور لطف یہ کہ نہیں نوکر نہ چاکر نہ کوئی ذاتی معاملہ نہ مقدمہ۔ مگر ان باتوں سے بڑے بڑے مطلب نکال لیتے ہیں۔ حکام رسی، اہل عملہ سے حسب حیثیت رسم وراہ۔ یہ خالص اوصاف ہیں جو منجملۂ فضائل سمجھے جاتے ہیں۔

مرزا صاحب سے جو لوگ آ کے ملے۔ ان میں سے ایک صاحب فدوی میاں خاندانی رئیس اس بستی کے تھے مگر بہ شرف انقلاب روزگار یا موروثی غفلت اور اسراف یا خود ان کی اولوالعزمی یا شرکا کے تنازع قانونی یا کارندوں کی چالاکی کی وجہ سے اب صرف اضافی رہ گیا تھا۔ اگرچہ زمانۂ ماسبق میں ایک بزرگ زمیندار تھے۔ مگر اب صرف برائے نام ایک موضع کا نمبر آپ کے نام سے رہ گیا تھا۔ اگرچہ اس پر بھی تصرف مالکانہ ان کے ایک کارندہ مسمّی شیورتن کا تھا جو کہ درحقیقت اسی گھر کا ساختہ پرداختہ تھا۔ مگر اب خود ان سے بدرجہا متمول اور ان کی کل موروثی جائداد کا اصلی مالک تھا۔ مگر بہ لحاظ اخلاق ظاہری جو کہ اکثر کسی مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ بھی ابھی تک

ان سے بہ مراعات پیش آتا تھا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ موضع سہجن پور جہاں کا وہ اصلی باشندہ تھا اسی کے یہ برائے نام نمبردار تھے تحصیل وصول شیورتن کے پاس تھی۔ مگر رعایا ابھی تک انھیں کا رعب و داب مانتی تھی اور اسامیوں سے دبا کے کبھی کبھی کچھ انھیں بھی وصول ہو جایا کرتا تھا۔ ایک اور وجہ شیورتن کی ان سے دبنے کی یہ تھی کہ شیورتن ایک چھوٹے درجہ کا آدمی تھا اور بستی کے لوگ بسبب ان کی قدیمی ریاست کے اِن کو مانتے تھے اور اسی خصوصیت کے لحاظ سے حکام اور اہل عملہ تک ان کی رسائی بہ سہولت ہو سکتی تھی۔ شیورتن کو ان سے بہت مدد ملتی تھی۔ اس لیے کہ اکثر مقدمات میں سعی سفارش کہنا سننا جو کچھ ہوتا تھا وہ ان ہی کے ذریعے سے ہوتا تھا۔ یہ دوا دوش، تملق و چاپلوسی جو اکثر موقعوں پر کرنا پڑتی تھی۔ اس کا تمام فائدہ شیورتن کو حاصل ہوتا تھا۔ آپ کا منشاء صرف اس قدر تھا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ فدوی علاقہ دار ہے اور فدی کے قبضے میں ابھی کل مواضع ہیں۔ اور شیورتن صرف ایک کارندہ ہے۔ صرف اس قدر تفاخر کے تحفظ کے واسطے آپ ہر طرح کی مشقتیں اور صعوبتیں گوارہ کرتے تھے۔ بستی میں جس قدر مکانات آپ کے بزرگوں کے تھے وہ اب شیورتن کے قبضے میں تھے اور ان میں اکثر اہلِ عملہ رہا کرتے تھے۔ اس کا کرایہ شیورتن ماہ بہ ماہ وصول کر لیتا تھا۔ ازبسکہ کرایہ لینا آپ اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ لہٰذا اگر کبھی اس کا ذکر کسی موقع پر آیا تو آپ اس سے نخاشی فرماتے تھے۔ اور شیورتن کو غائبانہ کلمات ناملائم سے یاد فرماتے۔

اسمِ مبارک آپ کا فدا علی تھا۔ مگر اس نام سے بہت کم لوگ واقف تھے۔ لوگ آپ کو اکثر فدوی میاں کے نام سے جانتے تھے۔ آپ کا خود یہ

بیان تھا کہ فدوی تخلص ہے۔ مگر اصل وجہ یہ تھی کہ ابتدائے سال میں آپ اس لفظ کو اپنی نسبت بہت استعمال فرماتے تھے۔ مثلاً "فدوی حاضر ہوا تھا۔" اور "فدوی غائب ہوا۔" اور "عرض فدوی کی یہ ہے۔" اور "فدوی آپ کا قدیمی نیازمند ہے۔" اس لفظ کے کثرتِ استعمال کی وجہ سے لوگوں نے آپ کا نام فدوی میاں رکھ لیا۔ پہلے غائبانہ اور پھر بالمشافہ اسی اسم سے موسوم ہو گئے۔ آپ نے مصلحتاً یہی تخلص اپنا قرار دے لیا۔ کیونکہ آپ کے تخلص کی (جواب کسی کو یاد بھی نہ تھا) شہرت نہ ہونے پائی کہ یہ لقب مشہور ہو گیا۔ اسی حالت میں اس تخلص کو بڑھاتے میں ڈال کر دمِ نقد یہ تخلص اختیار کر لینا عین مصلحت تھی۔

مرزا عابد حسین کے تقرر کی خبر ضلع میں ان کے آنے سے پہلے آپ کو مل گئی تھی۔ جس دن آپ تشریف لائے اس کے دوسرے ہی دن آپ سرا میں پہنچ گئے۔ پھر ملاقات کر لینا کتنی بڑی بات تھی۔

مرزا صاحب چار بجے کے بعد سرا میں آ کے ابھی بیٹھے ہی تھے کہ آپ نازل ہوئے اور بھٹیاری سے دریافت کر کے بے تکلف مرزا صاحب کے پاس چلے آئے۔

فدوی :۔ فدوی آداب عرض کرتا ہے۔

مرزا صاحب :۔ تسلیم!

مرزا صاحب بہت دیر آشنا تھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وضعِ تہذیب کے پابند نہ ہوں۔ جب ایک شریف صورت اس طرح تعارف کرے تو اس سے بے رخی کیوں کریں۔

"آئیے تشریف لائیے۔"

اس وقت اتفاق سے بھٹیارہ اس طرف کسی ضرورت سے آ نکلا۔

اس نے کہا "فدوی میاں سلام" اسی طرح آپ کو کئی شخصوں نے سلام کیا چلیئے نام بتانے کی بھی ضرورت نہ ہوئی۔ مرزا صاحب نے ازراہِ احتیاط اسمِ مبارک دریافت کیا۔

فدوی میاں :۔ بس یہی "فدوی"۔

مرزا صاحب :۔ (کسی قدر تعجب سے) دُرست!

فدوی میاں :۔ جی ہاں۔ وہ اصل حقیقت یہ ہے کہ نام تو میرا فدا علی ہے۔ مگر فدوی تخلص ہے۔ یہی زبان زد ہر کس و ناکس ہو گیا۔

مرزا صاحب :۔ بہت مبارک!

فدوی میاں :۔ آپ کی تشریف آوری کی خبر سن کے میں بہت مشتاق تھا کہ آپ سے ملوں۔ اس لیے کہ یہاں حکام اور اہل عملہ میں کوئی صاحب ایسے نہیں ہیں جو فدوی کو نہ جانتے ہوں۔

مرزا صاحب :۔ میں جانتا ہوں کہ اکثر صاحبوں کو اس قسم کا شوق ہوتا ہے۔

فدوی میاں :۔ جی ہاں، شوق کیا ایک لت سی ہو گئی ہے۔ آپ جانیے یار باشی میں تو وہ مزہ ہے کہ جہاں اس کا چسکا پڑا پھر نہیں چھوٹتا۔

مرزا صاحب :۔ صحیح ہے جس کو جس بات کا شوق ہو جائے۔ اگر اس میں تضیع اوقات بھی ہو مگر انسان سے بمشکل ترک ہو سکتا ہے۔

مرزا صاحب کے ان بلیغ فقروں کا مطلب یا تو فدوی میاں سمجھے نہیں یا سمجھ بوجھ کے تجاہل عارفانہ فرمایا۔ اس لیے کہ مرزا صاحب تو کچھ ایسے کھُرّے تھے بھی نہیں۔ آپ تو ایسے ایسے حکام اور اہل کاروں سے مل چکے تھے جو رُکھائی میں شہرۂ آفاق تھے اور فدوی کو اس بات کا فخر تھا کہ مرزا صاحب کیا چیز تھے۔ جیمس صاحب جو بہودہ ملاقاتوں سے اس

قدر نافر اور ہارب تھے کہ جو کوئی بلا وجہ ان کی ملاقات کو جاتا تھا، ڈنڈا لے کے پیچھے دوڑتے تھے۔ ان سے بھی فدوی میاں مل چکے تھے اور جب تک وہ اس ضلع میں رہے برابر ہر دوشنبہ کو سلام کے لیے جایا کیے علیٰ ہذا القیاس ڈپٹی تہور حسین خاں صاحب جنھوں نے اپنے بنگلے پر تختی لکھ کے لگادی تھی کہ کوئی میری ملاقات کو نہ آئے۔ وہاں بھی فدوی پہنچ گئے۔ اور آخر اس قدر رسم بہم پہنچایا کہ ان کا پیچوان پیا۔ ان کے خاصدان سے پان کھایا۔

فدوی میاں :۔ (مرزا عابد حسین سے) یہاں سرائیں تو آپ کو تکلیف ہوگی؟

مرزا صاحب :۔ جی ہاں۔ ابھی کل تو آیا ہوں مکان تلاش کر کے اٹھ جاؤنگا۔

فدوی میاں :۔ فدوی کے مکانات لاتعداد لاتحصیٰ ہیں۔ خالی پڑے ہیں۔ جو پسند آئے اس میں اٹھ چلیے۔

مرزا صاحب :۔ (کسی قدر تامل کے بعد) کس کرائے کے مکانات ہوں گے؟

فدوی میاں :۔ (مسکرا کے) آپ کو معلوم نہیں۔ دیہات میں اس بات کا عیب ہے۔

مرزا صاحب :۔ مگر میں اس کو معیوب سمجھتا ہوں کہ بلا کرایہ کسی کے مکان پر رہوں۔

فدوی میاں :۔ مگر جب کسی غیر کا مکان ہو نا۔ مرزا صاحب اس کا جواب دینے ہی کو تھے کہ میری آپ کی کب کی شناسائی ہے۔ مگر اسی اثناء میں ان سے ایک اور صاحب ملنے کو آگئے۔

پنڈت جانکی پرشاد صاحب ان کے ہم مکتب دوست جو اس ضلع میں تھانیدار تھے۔ مرزا صاحب ان سے مخاطب ہو گئے۔ فدوی میاں

سے ان سے حسب معمول بے تکلفی کی ملاقات تھی۔ بلکہ کچھ مذاق بھی فیما بین ہوتا تھا۔ مکان کا تذکرہ پنڈت صاحب کے سامنے بھی ہوا۔ پنڈت صاحب نے بھی یہی کہا کہ فدوی میاں کے کئی مکان خالی ہیں کوئی ان میں سے پسند کر کے اٹھ جائیے۔ ایک عہدے دار پولیس کے کہنے سے مرزا عابد حسین کو یہ تو اطمینان ہوا کہ فدوی میاں قابلِ اعتماد شخص ہیں۔

مرزا صاحب :۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ میں کرایہ نہ لوں گا۔

پنڈت صاحب :۔ اچھا اٹھ جائیے۔ حسابِ دوستاں در دل کا معاملہ ہو جائے گا۔

مرزا صاحب اس معمے کو نہ سمجھے۔ مگر چپ ہو رہے۔ اس اثنا میں فدوی میاں کسی ضرورت سے اٹھ گئے۔

پنڈت صاحب نے اصل حقیقت مرزا صاحب کے ذہن نشین کر دی۔ معلوم ہوا کہ مکان کا اصل مالک شیو رتن ہے۔ وہ آپ کے گھر کا کارندہ تھا اس لیے آپ اس کو مال مملوک سمجھ کے اپنا مال سمجھتے ہیں۔

مرزا عابد حسین :۔ مگر یہ تو کہیے کہ یہ حضرت میرے اوقات میں تو ہارج نہ ہوں گے۔ کیوں کہ آپ جانتے ہیں میں اس قسم کی ملاقاتوں سے گھبراتا ہوں۔

پنڈت صاحب :۔ کچھ ایسے ہارج نہ ہوں گے۔ مکان میرے دیکھے ہوئے ہیں۔ ان میں سے بڑا مکان جو آج کل خالی ہے، اس میں پہلے تحصیلدار صاحب رہتے تھے، آپ کی قسمت سے ان کی تبدیلی ہو گئی۔ فوراً لے لیجیے نہیں تو کوئی نہ کوئی لے لے گا اور آپ کو افسوس ہو گا۔ ان کے ہارج ہونے کی یہ صورت ہے کہ اس قسم کے لوگ جو بہت

لوگوں سے ملتے رہتے ہیں وہ کسی قدر مزاج شناس ہو جاتے ہیں۔ وہ آئیں گے ضرور خواہ ان کے مکان میں رہیے خواہ نہ رہیے۔ مگر جب آپ منہ نہ لگائیں گے دو چار منٹ ٹھہر کے چلے جایا کریں گے۔ آپ کا ہرج ہی کیا ہوگا۔ دوسرے ایک فائدہ بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ جس چیز کی ضرورت ہو (مسکرا کے) خواہ کیسی ہی ضرورت کیوں نہ ہو، یہ مہیا کر دیتے ہیں اور لطف یہ کہ بکفایت۔ مرزا صاحب پنڈت جی کے اس موقع پر مسکرانے سے کسی قدر بدظن ہو گئے تھے۔ مگر پنڈت جی نے اپنی تقریر کو اس طرح جاری رکھا۔

پنڈت جی :۔ مثلاً اب حال فی الحال تو آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہوگی۔ وہ آپ کی معرفت بہت جلد اور کفایت سے مل سکے گا۔ ماہواری غلہ، گڑ، گھی، راب جس شئے کی ضرورت ہوگی ان کی معرفت مل جایا کرے گی۔ اسباب ضروری مثل پلنگ، میز، کرسیاں، دریاں برتن، باسن، یہ سب ان ہی سے منگوائیے گا۔

مرزا صاحب :۔ مگر ان سب کا معاوضہ کیا دینا ہوگا؟

پنڈت صاحب :۔ کوئی معاوضہ نہیں۔ صرف وہی چند منٹ ہرج اوقات جو ان کے آنے سے ہوگا۔ یا اگر کچھ کمیشن وغیرہ لیتے ہوں تو اس کا علم نہیں۔

مرزا صاحب :۔ اچھا۔ اگر کمیشن لے کے عمدہ شے بہم پہنچا دیتے ہیں تو یہ کچھ ایسا معیوب نہیں۔

پنڈت جی :۔ ہاں بس یہی سمجھ لیجیے۔ میرا جہاں تک خیال ہے آپ کو ان کی ذات سے کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ ممکن ہے کہ کچھ فائدہ

ہو جائے۔

مرزا صاحب :۔ باہمی فائدہ رسانی تمدن کا اصل اصول ہے۔ اس کا میں منکر نہیں ہوں۔ مگر وہ معاملات جن میں طرفین سے غیر کافی معاوضہ پر کوئی شئے ایک سے دوسرے کی طرف منتقل کی جائے یا کوئی کام کیا جائے۔ اس کو میں ناجائز سمجھتا ہوں۔

پنڈت جی :۔ یہ دقیق منطق تو میری فہم سے باہر ہے۔ میرے کہنے کا خلاصہ یہ ہے کہ مکان لے لیجیے۔ پھر جس طرح چاہے ان سے معاملت رکھیے گا۔

مرزا عابد حسین :۔ پنڈت صاحب اصل امر تو یہ ہے کہ ایسے شخص کی معرفت مکان لینا بھی کسی قدر مسلکِ احتیاط سے دور ہے۔ مگر آپ فرماتے ہیں کہ اور کوئی مکان نہیں مل سکتا اور اصل معاملہ ایک شخص ثالث سے ہے کہ جس کا نام آپ نے لیا تھا؟

پنڈت جی :۔ شیورتن!

مرزا صاحب :۔ شیورتن سے۔ لہٰذا مکان لیے لیتا ہوں لیکن ان کے اس عجیب اخلاق کی وجہ سے مجھے خواہ مخواہ ایک قسم کا تعلق خاطر ہو گیا۔ لکھنؤ جو کہ میرا وطن اصلی ہے، وہاں کے عامیانہ اطوار و اوضاع سے مجھے نفرت ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ باہر جا کے ایسے لوگوں سے دور رہوں گا مگر یہاں بھی وہی سامنا ہوا۔

پنڈت جی :۔ جی ہاں۔ کیا کیا جائے۔ باہمیں مردماں بیاید ساخت۔

اس کے بعد پنڈت جی رخصت ہونے کو تھے کہ فدوی میاں پھر نازل ہو گئے اور آتے ہی فرمانے لگے "پنڈت جی! پھر مکان دیکھ لیجیے"

مرزا صاحب نے ذرا تامل کیا۔ لیکن پنڈت جی بھی فدوی کے ہم زبان ہو گئے۔ لیکن مرزا صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

پنڈت جی کی ٹمٹم سرا میں موجود تھی۔ مرزا صاحب اور پنڈت جی داہنے بائیں اور عقب میں فدوی میاں اور ایک حوالدار جو پنڈت جی کے ساتھ تھا بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ راستہ میں فدوی میاں اور حوالدار میں بڑے تپاک سے باتیں ہوتی جاتی تھیں۔ جس قدر حوالدار پنڈت جی کی ہمراہی کی وجہ سے لحاظ کرتا تھا اسی قدر فدوی میاں بے باک تھے۔

اثنائے راہ میں بلا مبالغہ سو دو سو آدمیوں نے فدوی میاں کو سلام کیا ہوگا۔

فدوی میاں سلام! فدوی میاں سلام۔ یہ صدائیں دس دس بارہ بارہ قدم کے فاصلے سے سنائی دیتی تھیں۔

سلاموں کی ترتیب یہ تھی کہ جو ملا پہلے اس نے تھانہ دار صاحب کو سلام کیا۔ ماتھے پر ہاتھ رکھ کے اور بہت مؤدبانہ جھک کے۔ یہ اوّل درجے کا سلام تھا۔ دوسرے درجے کا سلام مرزا صاحب کو کیا۔ مگر وہ بھی بلا صوت و صدا۔ تیسرا سلام ان لفظوں کے ساتھ حوالدار صاحب سلام۔ ماتھے پر ابھی تک ہاتھ رہتا تھا۔ چوتھا سلام آواز بلند کے ساتھ فدوی میاں سلام!

فدوی میاں کا جواب بھی خصوصیات کے ساتھ ہوتا تھا۔ بھتا سلام۔ مہتو سلام۔

اس درمیان میں کئی دیہاتی رنڈیوں نے بھی سلام کیا۔ فدوی میاں ہر ایک کا نام لے لے کے سلام کا جواب دیتے تھے۔ بیبا جان سلام۔

رسولن سلام۔

ہر سلام کے بعد فدوی میاں مزاج پرسی کو بھی واجب سمجھتے تھے۔ اور ہر شخص کے ساتھ طرزِ پرسش میں جدت ہوتی تھی۔

گاڑی اس مکان تک پہنچی جسے دیکھنا منظور تھا۔ واقعی مکان قابل رہنے کے تھا۔ زنانہ مکان پختہ۔ دو منزلیں۔ باہر بیٹھنے کا مکان جسے قصباتی زبان میں بیٹھکہ (بہ تشدید قاف) کہتے ہیں۔ نہایت ہی معقول اور اس کے سامنے بڑا سا احاطہ تھا۔ اس میں ایک طرف کھپریلیں تھیں۔ گاڑی، گھوڑے اور سائیس، خدمت گار وغیرہ کے رہنے کے لیے۔ جا بجا کچھ درخت مختلف قسم کے لگے ہوئے تھے مگر بہت ہی بے تکے پن سے۔ کچھ بیلا چنبیلی، کے جھنڈ۔ کچھ مہندی کی روشیں۔ بانس کا پھاٹک لگا تھا۔ غرض کہ مکان مرزا صاحب کو پسند آیا۔ شیورتن بھی اس موقع پر پہنچ گیا تھا۔ ایک سیاہ فام سا آدمی۔ دھوتی بندھی ہوئی۔ اودی چھینٹ کی مرزئی پہنے۔ اسی چھینٹ کی دوہری ٹوپی۔ پاؤں میں چمڑودا جوتا۔ گلے میں ایک بٹوہ پڑا ہوا۔ یہ آپ کا درباری لباس تھا۔ کیوں کہ اس وقت آپ براہِ راست کچہری سے تشریف لائے تھے۔ تھانے دار صاحب اور مرزا صاحب کے آنے کی خبر سن کے دوڑے چلے آئے۔ شیورتن سے کرایہ کے بارے میں گفتگو ہوئی۔ اس موقع پر فدوی میاں ذرا ٹل گئے۔ سات روپیہ ماہوار پر وہ مکان لے لیا گیا اور اسی شب کو مرزا صاحب کا اسبابِ سفر وہاں آگیا۔

دو پلنگ، تین کرسیاں فدوی میاں کی سرکار سے بلا طلب بھیج دی گئیں اور طوعاً و کرہاً مرزا صاحب کو رکھنا پڑیں۔

دریاں اور قالین مرزا صاحب کے ہمراہ تھے۔ کھانا پکانے کے

برتن بھی کافی موجود تھے۔ مکان کی صفائی اور مختصر سامان کی آراستگی میں فدوی میاں کی دخل در معقولات ہوتی رہی۔ ایسے لوگ جو ہر کسی کام میں خواہ مخواہ دخیل ہو جاتے ہیں، ان میں ایک خاص وصف ہوتا ہے جسے کسر نفس کے سوا اور کیا کہا جائے یعنی اس قسم کے لوگوں کو دوسروں کی اختلاف رائے سے چنداں ملال بھی نہیں۔ اگرچہ وہ اختلاف بُرے تیوروں سے کیا جائے۔ مثلاً اگر ان کی رائے ہوئی کہ دری اس طرح بچھانا چاہیے۔ اور پلنگ یوں لگانا چاہیے اور میز کا رخ یوں رہے اور دیوار گیریوں کا وہ موقع ہے اور دوسرے شخص کی آسائش کا یہ اہتمام کر رہے ہیں۔ ان میں سے ہر تجویز کو بلا دلیل یا یہ الفاظ کہہ کے "صاحب آپ نہیں جانتے" مسترد کر دیا۔ ہر ایک میں ترمیم کر دی تو ان کو نہ کچھ خفت ہوگی نہ ملال۔ ایسے ہی ہمارے سادہ دل رئیس موضع سہجن پور فدوی میاں صاحب تھے۔

جب گھر کی صفائی اور آراستگی سے فراغت ہوئی اور ہر چیز اپنے اپنے موقع سے لگا دی گئی۔ فدوی میاں نے فرمایا۔

لیجئے اُدر سیر صاحب آپ کا مکان سج سجا گیا اور اب جس چیز کی ضرورت ہو وہ حاضر کر دی جائے کیوں کہ خدا کے فضل سے سب کچھ ممکن ہے۔ فقط آپ کے اشارے کی دیر ہے۔

مرزا صاحب :۔ آپ کی عنایت کافی ہے۔ یہ سامان بھی میری ضرورتوں سے زیادہ ہے اور جو کچھ ضرورت ہوگی عرض کر دیا جائے گا۔۔

یہ آخری جملہ مرزا صاحب نے اس خیال سے کہا تھا کہ تھانہ دار صاحب نے پہلے ہی کہا تھا کہ گھوڑا فدوی میاں کی کوشش سے بہت جلد اور کفایت سے مل جائے گا۔ مگر فدوی میاں کو سلسلۂ کلام کے طول دینے کا